پروفیسر محمد عثمان

اقبال اور قرآن

قومی زندگی کی بقا و استحکام کی ایک نہایت اہم شرط یہ ہے کہ افرادِ قوم ایک ضابطۂ حیات، ایک دستورالعمل، آئین و قانون کی ایک دستاویز پر اس طرح متفق ہوں کہ اس پر عمل پیرا ہونے اور اس کی خلاف ورزی سے بچنے کو وہ زندگی کی سب سے بڑی سعادت خیال کریں اور اس کے لیے اپنے دلوں میں جذبۂ احترام کو کبھی کم نہ ہونے دیں۔

مذہبِ اسلام کا آغاز اور اسلامی سوسائٹی کی ابتدا نزولِ قرآن سے ہوئی ہے۔ تیئیس برس تک رسولِ کریمؐ پر خدا کا کلام نازل ہوتا رہا اور اوّلین دَور کے مسلمان پہلے مکّہ میں اور پھر مدینہ میں اپنے عقائد و اعمال کو قرآن کریم کے ارشادات و احکام کے مطابق ڈھالتے رہے۔ قرآن حکیم میں جو اوامر و نواہی مذکور ہوئے ہیں اور جو حدود خدا نے ملّتِ اسلامیہ کے لیے مقرر کر دیئے ہیں ان کی پابندی مسلمانوں کا شعار قرار پایا۔ پہلے تو رسولِ کریمؐ نے پابندی قرآن کی تحریک کی رہنمائی فرمائی اور آپ کے بعد خلفائے راشدین کا اسلوبِ حیات اور طرزِ عمل بھی اسی پر مبنی رہا۔ لیکن اب ایک بات کا اس میں اضافہ ہو چکا تھا۔ قرآن حکیم کے علاوہ بعض معاشرتی اور سیاسی امور میں جو فیصلے اور احکام رسولِ کریمؐ نے صادر فرمائے تھے خلفائے راشدینؓ نے ان کو بھی اپنا رہنما بنایا۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے حالات کے بدل جانے پر بعض امور میں حسبِ ضرورت اجتہاد سے کام لیا۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ کے زمانے تک اُمّہاتِ اولاد یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد پیدا ہو جائے برابر خریدی اور بیچی جاتی تھیں، حضرت عمرؓ نے اس کو بالکل روک دیا۔ آں حضرتؐ نے جنگِ تبوک میں جزیہ کی تعداد فی کس ایک دینار مقرر کی تھی، حضرت عمرؓ نے مختلف ملکوں میں مختلف شرحیں مقرر کیں۔ آں حضرتؐ کے عہد میں شراب نوشی کی کوئی خاص حد (سزا) مقرر نہ تھی، حضرت عمرؓ نے اسّی کوڑے مقرر کئے[1]۔ اسی طرح فتح خیبر کے موقع پر آں حضرتؐ نے مفتوحہ اراضی مجاہدین میں بانٹ دی تھی مگر حضرت عمرؓ نے مفتوحہ اراضی کی تقسیم کا طریقہ منسوخ کر دیا[2]۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ رسولِ کریمؐ کے ارشادات اور آپؐ کے فتووں اور فیصلوں کو جو خلفائے راشدینؓ کے علم میں تھے یا ان کے علم میں تحقیقاً لائے جاتے تھے انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان سے رہنمائی حاصل کی جاتی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس صورتِ حالات میں ایک تبدیلی اور واقع ہوئی۔ اب تک رسولِ کریمؐ کے ارشادات اور آپؐ کے

---

[1] الفاروق از مولانا شبلی (۱۹۲۴) صفحہ ۲۸۷۔ [2] الفاروق صفحہ ۲۹۴ نیز صفحہ ۱۹۶

مذہبی، معاشرتی اور سیاسی فیصلوں کا علم سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہا تھا۔ احادیث کا کوئی مجموعہ ضبطِ تحریر میں نہ آیا تھا۔ سارے عالمِ اسلامی میں سرچشمۂ ہدایت کے طور پر فقط ایک کتاب لکھی اور پڑھی جاتی تھی اور وہ قرآن تھا جس کے بے شمار نسخے تیار کروا کر اطرافِ سلطنت میں بھیجے جا رہے تھے۔ مگر اب احادیث کے مجموعہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور سب سے پہلے امام مالک (۹۵ - ۱۷۹ھ) نے ہجرت سے کوئی ڈیڑھ سو برس بعد اپنی "مؤطا" ترتیب دی جس میں ایک ہزار سے کچھ کم احادیث درج ہیں۔ اس کے بعد احادیث کے جمع کرنے اور لکھے جانے کا ایک عام دَور شروع ہوا اور آئندہ سو ڈیڑھ سو سال میں ایک درجن کے قریب بڑے بڑے مجموعہ ہائے احادیث تیار ہو گئے جن میں چھ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

جمعِ حدیث کے ساتھ ہی اسلامی علوم کی ایک اور شاخ نے پروان چڑھنا شروع کیا۔ رسولِ کریمؐ کی وفات کے بعد جوں جوں اسلامی سلطنت کے حدود وسیع ہوتے چلے گئے اور مختلف ممالک اور اقوام اسلامی قلمرو میں شامل ہوتی گئیں، تمدن و سیاست کے بے شمار مسائل پیدا ہونے لگے جن کا حل براہِ راست قرآن حکیم کی آیات میں موجود و مذکور نہ تھا لہٰذا جن لوگوں کے ذہن قانون سازی اور احکام و ضوابط استنباط کرنے کے لیے خاص طور پر موزوں تھے انہوں نے اس طرف توجہ دی۔ اس کام میں انہوں نے اوّل قرآنِ حکیم کو اپنا رہنما بنایا اور اس کے بعد مستند احادیث اور خلفائے راشدینؓ کے اقوال اور فیصلوں سے بھی روشنی حاصل کی اور جہاں اور جس معاملہ میں ان کو قرآن و سنّت سے براہِ راست کچھ مدد نہ ملی انہوں نے غور و فکر سے کام لیا اور اسلامی قانون کی عام اسپرٹ کو ملحوظ رکھ کر نئے قوانین وضع کیے۔ یہ قوانین اور قانون سازی کا عمل اصطلاح میں فقہ کہلاتا ہے۔ فقہ کے چار بڑے امام تسلیم کیے جاتے ہیں جن کا عہد بھی دوسری صدی ہجری تھا۔ گویا تیسری صدی ہجری تک اسلامی علوم کی تین بڑی شاخیں بارآور ہو چکی تھیں۔ اوّل قرآن، دوم حدیث و سنّت اور سوم فقہ۔

اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان تینوں علوم کا جو حقیقی درجہ ہے اور ان کے درمیان جو فرقِ مراتب دراصل پایا جاتا ہے اس کو ملحوظ رکھا جاتا لیکن ہر قوم کی تاریخ میں ایسے دَور ملتے ہیں جب صحت و اعتدال کا دامن فکر و نظر کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور لوگ غلو اور بے اعتدالیوں کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ رسولِ کریمؐ سے پہلے جو انبیاء آئے قرآن حکیم میں ان کی اُمتوں کے متعلق مذکور ہے کہ انہوں نے خدا کے رسولوں کو خدا کے برابر مرتبہ دے دیا اور ان کو معبود ماننے لگے۔ قرآنِ حکیم میں اس قسم کی لغزشوں اور گمراہیوں کا بیان اس قدر واشگاف اور عبرت انگیز ہے کہ مسلمان اس امر سے تو باز رہے کہ رسولِ کریمؐ کو خدائی میں شریک کرتے البتہ ہماری غلو پسند طبیعتوں نے ایک اور راستہ نکال لیا اور یہ خیال کیا جانے لگا کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ مولانا شبلی 'الفاروق' میں ایک جگہ لکھتے ہیں "بہت سے اکابر حدیثوں کو یہ درجہ دیتے ہیں کہ ان سے قرآن مجید کی منصوصات پر اثر پڑ سکتا ہے یعنی قرآن مجید کا کوئی حکم عام ہو تو حدیث سے اس کی تخصیص ہو سکتی ہے بلکہ اس کے ذریعہ قرآن مجید کا حکم منسوخ ہو سکتا ہے۔ امام شافعی کا یہی مذہب ہے۔"

- 5 MAY 1959

ایک طرف حدیث کی محبت میں لوگ یہاں تک نکل گئے کہ حدیث قرآن کی ناسخ قرار پائی تو دوسری طرف تقلید پسندوں نے فقہ پرستی شروع کر دی۔ جمہور اہل سنّت چار فقہی مدرسوں میں بٹ گئے اور باہمی اختلاف و نزاع سے گروہ بندی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر فرقہ اپنے امام کے اقوال اور فتووں کو اٹل اور غیر متبدل تصور کرنے لگا اور بہت سے لوگ یہ عقیدہ رکھنے لگے کہ اگر کسی مسئلے میں امام کے قول اور حدیث میں باہم اختلاف پایا جائے تو امام کا قول ترجیح کے قابل ہے۔ دوسرے لفظوں میں فقہ کو حدیث پر اور حدیث کو قرآن پر فوقیت و فضیلت دی جانے لگی۔ کچھ عرصہ کے بعد ان رجحانات کے خلاف شدید ردِّ عمل شروع ہوا۔ امام ابن تیمیہ اور بعض دوسرے اکابر ملت نے فقہ کے مقابلے میں حدیث کی برتری و بالاتری کا سکہ عوام و خواص کے دلوں میں بٹھایا اور پھر کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے حدیث کے مقابلہ میں قرآن کی فضیلت و اہمیت کو مستحکم کیا۔ جدید عہد میں جن مسلمان اکابر نے ملتِ اسلامیہ اور اسلام کی یہ خدمت انجام دی ان میں سیّد احمد خاں اور علّامہ اقبال مرحوم کے اسمائے گرامی سرِ فہرست ہیں۔

اس عہد میں بھی (ہر عہد کی طرح) کچھ لوگ ایسے ہیں جو سرے سے حدیث کی قدر و قیمت کا انکار کرتے ہیں چنانچہ چند سال پہلے حیدر آباد (دکن) سے ڈاکٹر عبداللطیف کے ایما پر جب برِّ عظیم ہند و پاک کے علمی طبقوں میں اس خیال کی اشاعت کی گئی کہ جدید تقاضوں کے مطابق احادیث کا ایک نیا مجموعہ موجودہ مجموعوں سے انتخاب کے طور پر شائع کیا جائے تو ایک طبقے نے اس کو قطعی غیر ضروری قرار دیا اور اس تحریک کی مخالفت کی۔ لیکن یہ ان لوگوں کی انتہا پسندی ہے جسے علّامہ اقبال پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ہر بات اور ہر معاملہ میں قرآن کے ساتھ حدیث کو لے آتے ہیں اور قرآن کے عالمگیر اور آفاقی تصوّرات کی وسعت اور فراخی کو بعض ایسی احادیث کا پابند بنانے کے درپے ہیں جس سے قرآن کی روحیت (SPIRIT) کو بڑا صدمہ پہنچتا ہے۔ یہ لوگ جوشِ عقیدت میں اُس بنیادی نکتے کو نظر انداز کر دیتے ہیں جسے خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کی نکتہ سنج اور محرمِ اسلام شخصیّت نے بالکل ابتدائی دَور میں واضح کر دیا تھا۔ فاروقِ اعظمؓ کا عشقِ رسولؐ کسی شخص سے کم نہ تھا اس کے باوجود انہوں نے حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ بلند کیا اور سنّتِ رسولؐ کی پیروی میں آں حضرتؐ کے ان فیصلوں کو جو سیاست اور تمدّن کے بدلتے ہوئے حالات سے تعلق رکھتے تھے حالات کے بدل جانے پر بدل دیا۔ حضرت عمرؓ کے اس طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"نبوّت کی حقیقت کی نسبت عموماً لوگ غلطی کرتے آئے ہیں اور اسلام کے زمانہ میں بھی یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔ اکثروں کا خیال ہے کہ نبی کا ہر قول و فعل خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ بعضوں نے زیادہ ہمت کی تو صرف معاشرت کی باتوں کو مستثنیٰ کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نبی جو حکم منصبِ نبوّت کی حیثیت سے دیتا ہے وہ بے شبہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ باقی امور وقت اور ضرورت کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ تشریعی اور مذہبی نہیں ہوتے۔ اس مسئلہ کو جس قدر حضرت عمرؓ نے صاف اور واضح کر دیا کسی نے نہیں کیا۔" (الفاروق: ۲۶۶)

مولانا شبلی سے پہلے بھی اسلام کے بڑے بڑے محققین یہی رائے رکھتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آں حضرت سے جو افعال و اقوال مروی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو منصب نبوت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی نسبت خدا کا ارشاد ہے "وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا" (۵۹:۷) یعنی پیغمبر جو چیز تم کو دے وہ لے لو اور جس چیز سے روکے اس سے باز رہو۔ دوسری قسم وہ ہے جس کی نوعیت تبلیغ رسالت کی نہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق خود آں حضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ "میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں جب میں دین کی بابت تم سے کچھ کہوں تو تم اس کی سختی سے پابندی کرو اور جب میں اپنی رائے سے تمہیں کچھ کہوں تو پھر یاد رکھو میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں[1]۔" اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ آں حضرتؐ نے طب کے متعلق جو ارشاد فرمایا یا جو افعال عادتاً صادر ہوئے یا جو باتیں آپؐ نے مرغوبات عرب کے موافق کیں نیز آپؐ کا وہ قول و عمل جب آپؐ کے سامنے کوئی جزوی مصلحت تھی اور وہ حدیثیں جن کا تعلق مقدمات کا فیصلہ کرنے سے ہے یہ سب دوسری قسم میں داخل ہیں۔ شاہ صاحب نے بہت سی حدیثیں مثال کے طور پر بیان کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے: "آں حضرتؐ نے لڑائی کے موقع پر فرمایا کہ جس نے کسی کافر کو قتل کیا اس کے ہتھیار اور زرہ بکتر وغیرہ اس کے ہو گئے[2]۔" شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ ایک ہنگامی حکم تھا اور ضروری نہیں کہ اب بھی اس پر عمل کیا جائے[3]۔ مجموعی طور پر دوسری قسم کی احادیث کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ آں حضرتؐ کے ایسے قول و عمل کی پابندی امت مسلمہ کے سب افراد پر عائد نہیں ہوتی۔

مختصر یہ کہ اگرچہ احادیث کا مطالعہ ایک مسلمان کے ایمان کو بڑھانے، اس کے اخلاق کو سنوارنے اور اس میں عبادت گزاری اور نیکی کا جذبہ ابھارنے میں بے حد ممد ہوتا ہے اور جو مسلمان حدیث کا منکر اور اس کے روحانی فیوض سے محروم ہے اس کی کم نصیبی میں کچھ کلام نہیں، چونکہ بے شمار احادیث تمدن و معاشرت کے ایسے امور سے تعلق رکھتی ہیں جن کی ضرورت اور تقاضے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں لہٰذا بقول شاہ ولی اللہ "ان کی پابندی امت مسلمہ کے سب افراد پر عائد نہیں ہوتی۔" اس کے مقابلے میں قرآن حکیم فرامین و احکام کا ایک ایسا مجموعہ ہے جن کی نوعیت وقت کے بدلنے سے بدل نہیں سکتی۔ قرآن کے بیان کردہ حقائق غیر متبدل اور اس کی حکمت لازوال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بہترین دماغوں نے قرآن حکیم ہی کو اسلام کا دستور اساسی اور آئین حقیقی قرار دیا ہے اور اسلامی لٹریچر کے بقیہ مجموعہ میں سے کسی چیز کو یہ درجہ نہیں دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہی کیا، امام ابوحنیفہ نے یہی کیا، شاہ ولی اللہ نے یہی کیا اور جدید دور کے آغاز میں سر سید احمد خاں نے بھی یہی کیا۔ حضرت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ (اردو ترجمہ از مولانا عبدالرحیم)، (۱۹۵۳ء)۔ جلد اول صفحات ۶۰۲ - ۶۰۵ [2] ایضاً صفحات: ۶۰۵-۶۰۶
[3] ایضاً صفحہ: ۶۰۶

عمر فاروقؓ اور شاہ ولی اللہ کے انداز نظر کی اوپر خاصی وضاحت ہو گئی ہے۔ امام ابو حنیفہ کے موقف کے لیے مولانا شبلی کی 'سیرت النعمان' دیکھنی چاہیئے۔ طوالت کے خوف سے یہاں ہم صرف مولانا حالی کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے سید احمد خاں کے موقف پر روشنی پڑتی ہے وہ لکھتے ہیں:

"سر سید نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اسلام کے متعارف مجموعہ میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عنداللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزمان کے دل میں القا ہوا ہے اسی طرح بے کم و کاست نبیؐ سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے، صرف وہی حصہ اس کا استحقاق رکھتا ہے کہ اس میں جو بات مسائل فلسفہ و حکمت کے خلاف ہو اس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے۔ پس انہوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ حسبنا کتاب اللہ اپنے جدید علم کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق محض قرآن مجید کو قرار دیا اور اس کے سوا تمام مجموعۂ احادیث کو اسی دلیل سے کہ ان میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام علماء و مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ ان کے جوابدہ خود علماء و مفسرین اور فقہاء و مجتہدین ہیں نہ اسلام، اپنی بحث سے خارج کر دیا (حیات جاوید: ۲۰۲)۔

موجودہ دور میں علامہ اقبال نے قرآن کے متعلق ان ہی خیالات کی ترجمانی کی ہے جس کو ابتدائی دور میں حضرت عمرؓ نے واضح فرمایا تھا اور جس کی تائید میں بڑے بڑے علماء و مفکرین نے اپنے نظریات پیش کئے۔ اقبال نے اس موضوع پر اپنے خیالات کی وضاحت 'رموز بے خودی' میں کی ہے۔ توحید و رسالت اور ملت اسلامیہ کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد 'رموز' کے پندرھویں باب میں وہ قرآن حکیم کی حیثیت سے بحث کرتے ہیں۔ اس باب کا عنوان ہے " در معنی ایں کہ نظام ملت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئین ملت محمدیہ قرآن است "۔ ابتداء میں وہ آئین کی اہمیت و ضرورت پر بعض دلائل پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں پھول کی پتی پر غور کرو۔ جب پتیاں آئین کی پابندی کرتی ہیں تو پھول بن جاتی ہیں۔ پھول جب آئین اتحاد کے پابند ہوتے ہیں تو گلدستے کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ آواز جب قانون موسیقی کی پابند ہو جائے تو نغمہ بن جاتی ہے مگر وہی آواز جب قانون کی پابندی ترک کر دے تو شور و غوغا ہو کر رہ جاتی ہے۔ قانون و آئین کی پابندی زندگی میں حسن و جاذبیت اور قوت و عظمت پیدا کرتی ہے۔ قومیں بھی پھول اور آواز کی طرح ہیں۔ جب وہ آئین کی سختی سے پابندی کرتی ہیں تو مضبوط و سربلند ہوتی ہیں مگر جب وہ تارک آئین ہو جائیں تو اپنی آبرو کھو بیٹھتی ہیں۔ ان کی قوت و حشمت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اقبال مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تمہیں معلوم ہے تمہارا آئین کیا ہے؟ تمہاری عزت و آبرو

کا راز کس میں ہے؟ اور پھر جواب دیتے ہیں کہ قرآن حکیم جو زندہ کتاب ہے، جس کی حکمت لازوال ہے، جس کی صداقت میں بال برابر فرق نہیں آنے کا، جس کی سچائیاں ہمیشہ رہنے والی ہیں، جس کے الفاظ میں نہ کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے، نہ ہوگی، جس کی آیات ابدی حقائق کی ترجمان ہیں، جس نے غلاموں کو آزاد کیا اور قیدیوں کو رہا کروایا، جو نوعِ انسانی کے نام خدا کا آخری پیغام ہے اور جسے رحمۃ للعالمین لائے۔ اس کتاب زندہ میں تمہاری حیات و نجات اور تمہاری عزت و آبرو ہے۔ یہ وہ آئینِ حیات ہے جس نے ایک منتشر اور ان پڑھ گروہ کو ایک عظیم الشان قوم میں بدل دیا۔ جس نے رہزنوں کو رہبر اور ناخواندوں کو صاحبِ علم و بصیرت بنایا۔ جس کی بدولت ناتواں طاقتور اور بے کس صاحبِ اقتدار بن گئے۔

قرآن حکیم کی حکمت و ہدایت اور اس کی انقلاب آفرینی اور حیات بخشی کی وضاحت کے بعد اقبال اس بات پر اظہارِ حیرت و افسوس کرتے ہیں کہ ایسی کتاب کی موجودگی میں اور ایسے سرچشمۂ ہدایت کے پاس ہوتے ہوئے مسلمان رسوم و رواج اور شیوہ ہائے کافری میں گرفتار ہو گئے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے ان کی زندگی اور سربلندی فقط قرآن حکیم کی پیروی پر موقوف ہے۔ اور جب تک وہ قرآن کو اپنا رہنما نہیں بنائیں گے گوہرِ حیات ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔

قرآن کی اس حیثیت سے بے خبر صوفی و ملا کی گمراہ کن موشگافیوں سے اقبال کو شدید اختلاف تھا۔ اور انہوں نے اس باب کے آخر میں صوفی و واعظ پر بھی دو دو تین تین شعر لکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صوفی جو کبھی محبت و اخوت اور ایثار و حمیت کا پیکر تھا، آج خانقاہوں کے اندر انتہائی بے ذوق زندگی کاٹ رہا ہے۔ نہ اس کے ایمان میں گرمی ہے، نہ اس کے عمل میں کوئی شعلہ۔ وہ عراقی کے شعر اور قوال کے نغموں پر سر دھنتا ہے مگر اس کا دل آیاتِ قرآنی کے سوز سے خالی ہے۔ اس کی نگاہ خانقاہی نظام کی بدولت حاصل کی ہوئی نذر نیاز سے آگے نہیں دیکھ سکتی۔

واعظ و مبلغ کی حالت صوفی سے کسی طرح بہتر نہیں۔ اگر صوفی قوال کی تھاپ پر مست ہے تو واعظ افسانہ طرازی اور داستاں گوئی میں محو ہے۔ اس کے الفاظ زوردار مگر مطالب بے جان ہیں۔ وہ حدیث و فقہ کی دور از کار بحثوں اور بے معنی موشگافیوں میں رات دن کھویا رہتا ہے اور زندگی کی راہ سے بھٹک گیا ہے۔ اس کی زبان پر خطیب و دیلمی کا چرچا اور ضعیف و شاذ حدیثوں کا ذکر رہتا ہے۔ کاش اس کو قرآن سے حقیقی شغف ہوتا:

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند — معنیٔ او لیست و حرفِ او بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او — با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او

صوفی و واعظ کے متعلق اپنی انہی خیالات کو وہ اپنی مشہور نظم 'ساقی نامہ' میں یوں بیان کرتے ہیں:

بھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا   یہ سالک مقامات میں کھو گیا

اس کا نتیجہ اُمت کے حق میں بڑا تباہ کن ثابت ہوا۔ مسلمان قرآن حکیم کو چھوڑ کر روایت پرستی کا شکار ہو گئے جس نے ان کی تمام تاب و توانائی سلب کر لی اور ایمان کا وہ شعلہ جس کی گرمی و حرارت نے ان کو علم و سیاست کے میدان میں انسانیت کا رہنما بنایا تھا، بالآخر سرد پڑ گیا؛

حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ اُمت روایات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے   مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

'رموز' کے علاوہ بھی اقبال نے کئی جگہ قرآن حکیم کی حکمت و عظمت پر اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں میں مثنوی مسافر (۱۹۳۵ء) سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ ۱۹۳۳ء کی بات ہے کہ افغانستان کے موجودہ حکمران شاہ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ نے علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو اپنے ہاں کے نظام تعلیم کے بارے میں مشورے کے لیے کابل آنے کی دعوت دی۔ شاہ افغانستان سے اقبال کے دیرینہ مراسم تھے اور دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ مثنوی 'مسافر' اقبال کے اس سفر افغانستان کے تاثرات کا بیان ہے۔ اقبال جب لاہور سے چلے تو شاہ 'درویش خو' کے لیے قرآن مجید کا ایک نسخہ بغرض ہدیہ ساتھ لے گئے۔ اس ہدیہ کو پیش کرنے کی تقریب کا حال انہوں نے "مسافر" میں ایک جگہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں جب میں نے قرآن حکیم کا تحفہ شاہ کو دیا تو کہا" اہل حق کی یہی دولت و ثروت ہے۔ اس کے باطن میں حیات مطلق کے چشمے بہتے ہیں۔ یہ ہر ابتدا کی انتہا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے۔ اس کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے۔ میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز و گداز سب اسی کا فیضان ہے:

گفتم ایں سرمایۂ اہل حق است   در ضمیر او حیات مطلق است
اندرو ہر ابتدا را انتہا است   حیدر از نیروئے او خیبر کشا است
نشۂ حرفم بجوش او دوید   دانہ دانہ اشک از چشمش چکید

نادر شاہ مرحوم بھی قرآن کے عاشق صادق اور اس کے محرم اسرار تھے۔ ان کا جواب بھی کچھ کم ایمان افروز نہیں۔ شاہ نے ہدیہ قبول کرتے ہوئے بتایا کہ جب وہ جلاوطن تھے اور کوہ و صحرا میں غمزدہ وقت کاٹ رہے تھے۔ جب ان کے پاس زندگی کے وسائل کی کمی اور مادی طاقت کا فقدان تھا۔ جب ان کا کوئی ساتھی اور غمخوار نہ تھا تو یہی کتاب ان کی رفیق، رہنما اور ہمدرد و غم گسار رہتی۔ اسی قرآن کی بدولت انہوں نے زندگی کی ہر مشکل پر قابو پایا اور اپنے راستے کی تمام دشواریوں کو دور کیا۔

گفت ناور درجہاں بیچارہ بود — از غم دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر — از غمانِ بے حسابم بے خبر
نالہ با بانگِ ہزار آمیختم — اشک با جوئے بہار آمیختم
غیر قرآں غم گسارِ من نہ بود
قوتش ہر باب را بر من کشود"

قرآن سے اقبال کے عشق و محبت کا دوسرا رخ یہ ہے کہ فاروق اعظمؓ کی طرح انہوں نے بھی اسلامی لٹریچر کے بقیہ حصے کو قرآن کے برابر درجہ نہ دیا۔ وہ حدیث کے شیدائی اور فقہ اسلامی کے بڑے قدردان تھے اس کے باوجود جہاں تک ان کی شرعیت اور قطعیت کا تعلق ہے وہ اسے ہرگز تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس بات کا ثبوت ان خطوط سے بھی ملتا ہے جو اس موضوع پر انہوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھے ہیں۔ ۱۹۲۴ء اور اس کے بعد کے کتنے ہی خطوط میں حدیث کی شرعی حیثیت کا سوال زیر بحث آیا۔ ۱۹۲۴ء میں ان کی نظر سے ایک امریکی مستشرق کی ایک کتاب گزری جس میں علامہ آمدی کے حوالے سے درج تھا کہ اجماعِ صحابہ قرآن حکیم کے کسی حکم کو ملتوی یا منسوخ کر دینے کا مجاز تھا۔ اقبال کو اس خیال پر بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے جب اس بات کی وضاحت سید سلیمان سے چاہی تو معلوم ہوتا ہے سید صاحب نے صحابہ کے اس (مفروضہ) طرز عمل کے لیے کوئی جواز یا تاویل پیش کی اور کہا کہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ صحابہ کے علم میں ایسا کوئی حکم ہونا ممکن تھا جس کی بنا پر وہ نصِ قرآن کے دائرۂ عمل کو گھٹا یا بڑھا سکتے تھے۔ اس پر اقبال نے سید سلیمان کو لکھا کہ

"وہ ناسخ حکم سوائے حدیث نبوی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ناسخِ قرآن ہو سکتی ہے جس سے کم از کم مجھے تو انکار ہے۔" (اقبال نامہ حصہ اول: ۱۳۵)

جب بحث آگے بڑھی تو ایک موقع پر سید صاحب نے رسولِ کریمؐ کے طرزِ اجتہاد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ حضور سرورِ کائنات سے جب کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو آپؐ بعض دفعہ وحی کا انتظار فرماتے۔ اگر وحی نازل ہوتی تو اس کے مطابق مسائل کا جواب دیتے اور اگر وحی کا نزول نہ ہوتا تو قرآن شریف کی کسی آیت سے استدلال فرماتے اور جواب کے ساتھ وہ آیت بھی پڑھ دیتے۔[۱] اس کے جواب میں اپنے ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"دریافت طلب امر یہ ہے کہ جو جواب وحی کی بنا پر دیا گیا وہ تمام اُمّت پر حجت ہے (اور وہ وحی

---

[۱] دیکھیے اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۱۴۱

بھی قرآن شریف میں داخل ہوگئی، لیکن جو جواب محض استدلال کی بنا پر دیا گیا جس میں وحی کو دخل نہیں، کیا وہ بھی تمام اُمت پر حجت ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس سے لازم آئے گا کہ حضورؐ کے تمام استدلالات بھی وحی میں داخل ہیں۔ یا بہ الفاظِ دیگر یہ کہ قرآن وحدیث میں کوئی فرق نہیں" (ایضاً: ۱۴۲)

اس کے جواب میں سیّد صاحب نے لکھا کہ جو جواب محض استدلال کی بنا پر دیا گیا وہ بھی وحی ('وحی خفی') میں داخل ہے اور تمام اُمت پر حجت ہے تو ایک عرصہ کے بعد بڑے لطیف پیرایہ میں اپنے اختلافِ رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہیں لکھتے ہیں کہ

"عبادات کی حد تک تو ٹھیک لیکن جہاں تک معاملات کا تعلق ہے شرعیتِ احادیث کے سوال پر ابھی تک میرا دل اپنی تحقیقات سے مطمئن نہیں ہوا" (ایضاً: ۱۴۷)

میرا خیال ہے کہ اس مرحلے پر اگر اقبال کو سیّد سلیمان ندوی کی بجائے مولانا شبلی یا شاہ ولی اللہ جیسا رفیق و رہنما مل جاتا تو ان کا دل مطمئن ہوتا کیونکہ عین اس موضوع پر حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں وہ بحث کی ہے جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے اور جس کے بارے میں انہوں نے نہایت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ معاملات اور امور تمدّن و معاشرت میں حضور نبیؐ کریم کا استدلال تمام اُمت پر حجت نہیں ہے۔

اور بالآخر ہوا بھی یہی۔ چند سال بعد مولانا شبلی کی 'الکلام' میں اقبال کی نظر سے شاہ ولی اللہ کا ایک ایسا اقتباس گزرا جس نے ان کو چونکا دیا (ایضاً: ۱۶۰)۔ اس تقریب سے انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کیا (ایضاً: ۱۶۲) اور جو خیال ان کے دل کی گہرائیوں میں سالہا سال سے موجود تھا اور جس کی تصدیق و تائید وہ کسی مستند عالمِ دین سے چاہتے تھے وہ ہوگئی۔ پھر سیّد سلیمان کہتے ہی رہے کہ مولانا شبلی نے شاہ صاحب کے الفاظ کے جو وسیع معنی لیے ہیں وہ صحیح نہیں (ایضاً: ۱۶۱) مگر اقبال کا دل اب اپنی تحقیقات سے مطمئن ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں جب ایک علم دوست ملاقاتی نے ان سے دریافت کیا کہ کیا خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خدا تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لیے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں (ملفوظاتِ اقبال: ۵۸)۔ ایک اور موقع پر ایک سوال کے جواب میں آپ نے کہا "میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں" (ایضاً: ۹۵)

مختصر یہ کہ جہاں تک آئین و دستور کا تعلق ہے، جہاں تک بنیادی عقائد و معاملات کا واسطہ ہے اقبال ہم کو قرآن حکیم کی طرف لوٹنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس ضمن میں "رموزِ بے خودی" کے زیرِ نظر باب کے

کتنے ہی اشعار قابل مطالعہ ہیں۔ میں یہ مضمون اس شعر پر ختم کرتا ہوں جس میں اقبال نے ہمیں خبردار کرتے ہوئے کہا کہ اے مسلمان! اگر تو زندہ رہنا چاہتا ہے، اگر تجھے آبرو کی زندگی مطلوب ہے تو تیرے لیے فقط ایک راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تو قرآن کو اپنا رہنما و دستورِ حیات بنالے۔ اس کے بغیر تیری فلاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بقرآں زیستن

پاکستان کے بلند پایہ مفکّر اور نامور مصنّف

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

بانیِ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی یاد میں ادارہ کے ترجمان

مجلّہ "ثقافت"

کا

خلیفہ عبدالحکیم نمبر

عنقریب شائع کیا جائے گا جو خلیفہ صاحب کی ثروتِ افکار، علمی فضیلت اور دینی خدمات نیز ان کی دلکش اور ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والے مضامین کا ایک نادر مرقع ہوگا۔ مرحوم خلیفہ صاحب کے احباب اور قدرشناس نہ صرف پاکستان و ہندوستان بلکہ مشرقِ وسطیٰ، یورپ امریکہ اور مشرقِ بعید کے مختلف ممالک میں بھی موجود ہیں۔ اور یہ خاص نمبر ان کے مقالات و تاثرات پر مشتمل ہوگا۔

ملنے کا پتہ

سیکرٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور